

مشق کی انوکھی کتابیں جو یقیناً آپ کے ذہنوں پر نقش ہو جائیں گی  
مشق نمبر کا دل نہیں نقش آفریں کہانیاں

## بے غیرت کہیں گی

ایڈیٹر اور ایس ایچ



اس لاج کی ماری سہاگن کی کتھا جس نے اپنے ساجن کا جوگ لے لیا تھا

گلی میں کھڑی سبزی خریدے تو وہ دروازے کے چھتے چھپ کر اس کے موٹے ٹنگے پیٹ پر ایک روڑا ہی تھپتھپ ماریں پیٹ کا منگہ پھوٹے تھوڑی دہلی ہوں تو ذرا اہل کر پانی وانی ہی پی لیا کریں۔ ہم دن بھر سنتے لاجو دیدی کو پکار پڑتی رہتی تھی یا پھر لعنت پھینکا کر.....  
میری اماں کہا کرتی تھیں۔ وہ لوگ ہندو ہیں ان کے یہاں نہیں جایا کرتے۔ وہ چھوٹے بچوں کو کاٹ کر بھکوان کو بی چڑھاتے ہیں۔ شروع شروع میں میں ڈر گیا تھا، جھٹ میرے ذہن میں کالے پتھر کی بنی مورتی در آتی جس کی لمبی زبان سے خون ٹپک رہا ہوتا اور آنکھیں وحشت سے اٹنی پڑتیں۔ رفتہ رفتہ یہ تصور بھی زائل ہوتا گیا اور میں نے اماں کی بات کو اہمیت دینا چھوڑ دیا کہ ایسا کہاں ہوتا ہے بھلا اور اگر ایسا ہوتا تو بھلا حیدر چاچو روز اوپر منڈیر پر بازو رکھے لاجو دیدی کی سب سے چھوٹی نند سہرا سے کیوں باتیں کرتے رہتے اور میں بیسنی روٹی کھاتے چھتے کی سیزھیوں پر بیٹھا کرتا تھا۔ اس کی چوکیداری کے بدلے میں مجھے بھی ایک روٹی اور کبھی پاپڑ ملا کرتے تھے۔  
لاجو دیدی بیسنی روٹیاں اور پاپڑ بنایا کرتی تھیں۔

مجھے لاجو دیدی بہت پسند تھیں اور یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت تھی کہ میں نے اپنی ساری زندگی میں لاجو دیدی سے زیادہ ڈھیٹ عورت بھی نہیں دیکھی۔ عجیب عورت تھی بالکل مٹی کا مدھو..... ساس پوپلا منہ بھر بھر کر گالیاں بکا کرتی، منڈیں الگ بے عزتی کرتی رہتیں، شوہر کے توجو تے ہی اس کے سر پر ٹوٹتے تھے مگر مجال ہے، اف بھی کر جائیں۔ جب دیکھو سر جھکائے کبھی لمبا جھاڑو پکڑے دہلیز دھور ہی ہیں، کبھی چھت پر کپڑے دھو دھو پھیلاتیں، ابھی لال مرچیں سکھا رہی ہیں، ابھی چاول چن رہی ہیں، دال گھوٹ رہی ہیں۔ میں جب بچی گزرا کرتا، چو پٹ کھلے دروازے سے کچھ نہ کچھ کرتی ہی نظر آتیں۔ ایک کمرے کا تو گھر تھا جس کے سرخ فرش کو گنگے، کتھے کی گلکاریاں مزید رنگ گئی تھیں کونوں پر سے۔

لاجو دیدی سے مجھے کوئی خاص ہمدردی تھی۔ تائی اماں کہتی ہیں کہ میں نے ان کے بچوں کو بدتمیزی سکھائی ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں دیدی کو بھی تھوڑی سی بدتمیزی، کم از کم غلیل سے کنکر مارنا تو سکھا ہی دوں تاکہ جب کبھی اُس کی کالی بیہنس جیسی ساس

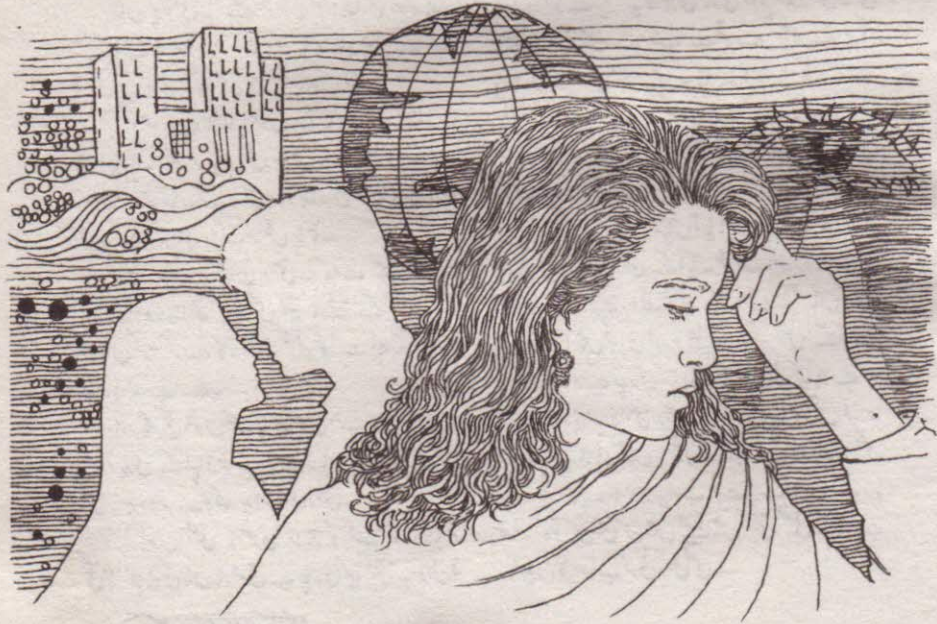
چھوٹے چھوٹے گھر تھے، کوشش کر کے بھی ادھر کی باتیں ادھر چھپی نہ رہ سکتیں۔ ہمیں سب پتا چلتا رہتا تھا۔ لاجویدی کی شیکھر سے گائی کونواں برس تھا مگر اب تک گود خالی تھی۔ گھر والے ہر طرح کا دوا دارو کر کے اب تھک ہارے تھے مگر شیکھر بہت برداشت والا تھا اور نکلاس کی ماں تو لاکھ سر پٹی کہ..... ”نکال باہر کرے اس چھٹی کو، تینوں ٹائم کھا کے بس پڑی رہے ہے۔ نحوست کی ماری جو بچہ نہ پیدا کر پائے وہ بھلا عورت کس کام کی.....“

یہ تمام باتیں سن کر لاجویدی خاموش ہی رہتیں، چپ چاپ سب سنتیں۔ مجھے برا غصہ آتا..... حد ہونی ہے میرا دوست کہتا تھا، گالی کھا کر بے غیرت لوگ چپ رہتے ہیں۔ غیرت مند آدمی بولتا ہے۔ مجھے جب ماجد کے بھائی نے گالی دی تھی تو میں نے کبھی تو بڑا سا پتھر مار کر اس کا سر پھاڑ دیا تھا..... اور ایک یہ ہیں، بہری کہیں کی، سنتی ہی رہتی ہیں۔ واقعی بے غیرت ہیں..... میں نے اپنی زندگی میں لاجویدی سے زیادہ بے غیرت عورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔

ہفتے میں دو مرتبہ سائیکل پر ایک کانے انکل آیا کرتے تھے اور یہ مال تھیلیاں بھر بھر لے جایا کرتے۔ اس دن لاجویدی کے گھر سے کھانے کی اشتہا بھری خوشبو آیا کرتی تھی۔ اس دن ان کے گھر سے لاجویدی کو پکارتی غصے بھری آوازیں بھی ذرا کم ہی آتیں۔

لاجویدی کا لمبا سا قد تھا، مردوں جیسا وہ اکثر گلابی رنگ کی کاشن کی ساڑھی باندھا کرتیں اور کانوں میں موٹیے کی کلباں، ان کی سانولی رنگت پر سر مٹی آنکھیں عجیب عم انگیز سا تاثر دیتی تھیں لیکن جس دن ذرا وہ کاہل، سرمد لگا کر دنداسہ ملتیں تو یہی آنکھیں لو دینے لگتیں، گمان گزرتا لاجویدی کی کوئی بہن آنکھ پڑی ہیں ان کے ہاں، ان کی آواز بھی بہت خوبصورت تھی، میٹھی میٹھی کو ملتا کا سندرا احساس لیے۔ صبح صبح وہ چھوٹی گھنٹی ہلا ہلا کر بھجن پڑھا کرتیں تو میں کبھی شرت کے بٹن بند کرنا بھول جاتا، کبھی بوٹ کے تسمے بند کرنا۔ امی کو سخت چڑھتی لاجویدی سے اور اس کے بھجن سے..... جب تک وہ گاتیں یہ بتی جھکتی رہتیں۔

ان کے اور ہمارے گھر کی ایک ہی دیوار تھی،



لا جو دیدی کو شیکھر انکل سے عشق تھا، بچپن میں ہی ان کی بات سنی ہو گئی تھی مگر جوان ہو کر شیکھر انکل کے خیالات بدل گئے تھے وہ سگائی کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ہائیں..... جس نے سنا، محضول میں اڑا دیا۔ ”ایسی بھی کیا لجا کہ تم بیاہ سے انکاری ہو بیٹھے ہو؟“ آج کل تو لوڈے ہاتھ بڑھانہ سے بڑھاگ لیا کرتے ہیں۔“ بات آئی گئی ہو جانی سے کچھ اور سرک جاتا ہر چار چھ مہینے بعد شیکھر انکل کی میا کو بارات سجانے کا بخار چڑھتا۔ شام کی چائے میں اسے لیے لیے بیٹھتیں خوشامدیں کرتیں، منصوبے بناتیں۔ لا جو دیدی کے حسن بے مثال خصوصاً بڑی آنکھوں کے وہ وہ قصیدے پڑھتیں کہ شیکھر تلملا کر رہ جاتا۔

”تو اماں.....! میں کیا کروں اس کی آنکھ اگر یہ بڑی بڑی ہے تو کون سا مجھے اس کی آنکھ سے دیکھنا ہے؟“

”تو بس ہاں کر دے“ آنگن چمک جاوے گا میرا“ جیتے جی بہو کا ارمان پورا ہو جاوے تو چار دن بچے کھلا لوں تیرے اور بھلا کیا ہوں گے مجھ بڑھیا کے ارمان.....“ شیکھر کے کان پر جوں تک نہ رہیں۔

اماں پوچھتی۔ ”تجھے جو کوئی اور بھاگنی ہو تو بھاڑ میں جائے لا جو جی..... بتا مجھے ہاتھ پیر جوڑ کے لے آؤں گی تیری خوشی میں ہی خوش ہوں بیٹا.....!“ شیکھر چپ بیٹھا ہاتھوں پر آتا پسینہ پونچھتا رہتا پھر اچانک اٹھ کر باہر نکل جاتا۔ رات دوسرے پہر آتا بنا کچھ کھائے ہے ہی سو رہتا۔ صبح مندا اندھیرے ہی چائے کی پیالی سڑک کر نکل پڑتا۔

بیچھے اماں پریشان رہتی۔ ”رات میں بھی پنا کھائے سو رہتا تھا، سوچ بھی بغیر ناشتے کے گیا۔ اچھا“ بھگوان کرم کرے گا۔ آج شام گھومتی ہوئی بہت پسند ہے اسے۔“

اور پھر کئی دنوں تک بات یوں دب جاتی مگر ادھر لا جو دیدی کے کیاؤنڈ میں بات زیادہ دن دہی نہ رہتی تھی۔ ہر دوسرے لوکھ بدالگی ہی رہتی۔

”کیوں بھئی مادھوی لا جو کو کب تک بیاہو گی؟“ لا جو کی ماں مادھوی بے چاری کیا کہتی یہ سوال تو

خود اس کو اندر ہی اندر ڈستار ہٹاتا تھا۔ لا جو جی سوہویر سے نکلی تھی، لبا سرو قد چڑھتی جوانی، سلونی رنگت، کئی آپہں بھرتے تھے تو کئی نیم نکل تھے پر لا جو تو ناک پر کھی نہ بیٹھے دیتی تھی کجا کہ کسی ایرے غیرے کے نام کی نتھ بنے۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب سے ہی سنتی آئی تھی کہ شیکھر اس کے بابو جی کے دوست کا بیٹا ہے۔ وہ اسی سے بیاہی جائے گی۔ پہلے پہل بھلا کیا اہمیت دیتی پر ایک مرتبہ جب وہ سب بچپن میں دیوالی پر آئے تھے لا جو نکل پہ پھیلے پر کھڑی بیٹھے کچھ کھا رہی تھی۔ شیکھر بھی آن کھڑا ہوا تھا۔ کتنی شلوار سوٹ میں کالی رنگت پر سامنے کاٹو نا دانت..... لا جو جو کسی تو ہستی ہی چلی گئی اور پھر منتہ منتہ ہی بولی۔ ”بندر..... کالا بندر.....“

شیکھر سے بھی جو بن بڑا کہا اور بیچھے دوڑا پر لا جو کہاں ہاتھ میں آئی تھی آگے بیچھے دوڑتے کیاؤنڈ میں داخل ہوئے تو سامنے کچھی چار پائیوں کی قطار پر نئی چادریں بچھی تھیں اور ہتے کی یہی مہک میں تازہ گڑ کی باس بھی شامل تھی۔ لا جو ٹھٹک کر رک گئی۔

”یہ ہے اپنی لا جو.....“ بابو جی نے پیار سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

”ارے..... یہ تو بڑی ہو گئی اور سنہر بھی۔ سچ کہوں بیٹا، میں نے جب سے تم سے شیکھر کے برکی بات کی تھی تو کیا معلوم تھا یہ جو ہیا ہی ایسا رنگ نکالے گی بھئی بہت کرپا ہے بھگوان کی۔“ یہ بات سن کر لا جو شرماسی گئی اور جلدی سے نئے سے جھاڑ کر اندر اپنے گھر کی طرف بھاگ نکلی تھی۔

”پگنی..... تیرا سسرال آیا بیٹھا ہے۔ کیا کد کڑے بھرتی ہے۔ چچی بن کے ایک طرف بیٹھ رہ۔ لے یہ دھنیے کے پتے الگ کر کے دے۔“ ماں نے سرگوشیوں میں خبر لی اور دھنیے کی چنگیر اس کے آگے کر دی۔ وہ بے چاری کیا جانتی کہ سسرال کیا بلا ہے سو بس سر نہ ہواڑائے جتی رہی۔ ذرا دیر میں عورتیں اسے اپنے پاس بلائی تھیں باتیں کرتیں، کوئی رو پیہ نکا بھی رکھ دیتی تھی پر۔ لا جو کو یہ سب بہت عجیب اور نیا لگ رہا تھا۔ وہ تو سن ہی سن میں بسنے میں بھینکی ہتھیلی میں دبے روپیوں کا حساب کرتی رہی تھی۔

رات کو جب مہمان رخصت ہوئے تو ماں نے سب روپیوں کا حساب مانگ لیا۔ لاجو جاتی تھی اس نے بھی پورے پانچ روپے اپنے اندر الگ سے چھپا رکھے تھے۔ لاجو نے سوادور روپے ماں کی تھیلی پر رکھے تو ان کا منہ لٹک گیا۔

”ہوں..... اونچی دکان پھیکا پکوان۔ کبھی چوس کہیں کے۔ چل بیٹا.....! یہ تو یہی رکھ لے۔“ لاجو دیدی کی تو جیسے لائری ہی نکل آئی تھی۔ ”اور سن تو نے شیکھر کو بندر کیوں بولا بھلا؟“

”بندر ہی تو لگتا تھا ماں.....! مزے سے چاول کھاتے کھاتے پھر اس کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

”اول ہوں..... ایسا نہیں بولتے۔ تیرا بیاہ ہوگا اس سے۔ تیرے بابو جی نے بات کر رکھی ہے۔“

”ہائے ماں.....! اس سے کیوں؟ میں نہ کروں اس سے بیاہ ویاہ۔“

اماں ہنستے ہنستے دہری ہو گئی تھیں۔ ”او بے شرم! اپنے منہ اپنے بیاہ کی بات نہیں کرتے۔“

☆.....☆

وقت نے پھیرے لیے تو لاجو اب جوان کھڑی تھی۔ ماں کے کہنے کے مطابق اب وہ اپنے بیاہ کی بات بھی نہیں کرتی تھی مگر باقی سب کرتے تھے۔ اپنے ساتھ شیکھر کا نام سن کر اسے اب عادت ہو چکی تھی اس نام کی۔ اس نے خیالوں میں ہی اس کو اپنا پتی پریشور مان لیا تھا۔ تین چار بار اسے دیکھا بھی تھا۔ ایک مرتبہ چاندنی ماسی کی بارات پر پھر ایک دفعہ بڑی پوجا بھری تھی کیاؤ نڈ میں اور ایک دفعہ کلشن کے مندر میں اور لاتعداد مرتبہ سیاہ رات میں اپنے خوابوں کے چمکتے جزیروں میں خوب قد کاٹھ نکالا تھا اس کالے بندر نے۔ وہ راتوں پر پھنسی پھنسی جینز اور بازوؤں پر ننگ پڑتی ٹی شرٹ پہنتا تھا۔ بال گردن تک بڑھا رکھے تھے اور داڑھی موچھ ندار..... دائیں کان میں چھوٹی سی مندری تھی۔ لاجو دیدی تو اب شیکھر جی پر قربان ہو گئی تھیں۔

☆.....☆

ہولی دیوالی پر لاجو کے لیے سسرال سے بڑے

ایچھے ایچھے جوڑے آیا کرتے تھے۔ سکھیاں بالیاں رشک کرتیں مگر بیاہ کا معاملہ تو مسلسل کھٹائی میں تھا۔ واہ واہ کرنی زبائیں اب بابا کرنے لگ گئی تھیں تو لاجو کی ماں خود ہی بیٹی کے سسرال چاہتی تھی۔

”لاجو ہم پر کوئی بوجھ تو نہیں پر تم بھی جانو ہو جدھر کا انگ ہو اُدھر ہو سچے ہے۔ سارا کمپونڈ باتیں کرتا ہے۔ کوئی مسئلہ ہے تو کہو ہم آپس میں کر گزریں گے۔“

”ناہیں بہن.....! مسئلہ کیا ہوگا تم فکر ہی نہ کرو ہم دیکھتے ہیں جلدی ہی کچھ خبر دیں گے تم تیاری رکھو۔“

”لاجو کے پتا جی بھی گھلے جاتے ہیں بیماری نے مانو جڑ پکڑ لی ہے ان میں۔ سانس کا کیا بھروسہ کب نہ آئے اپنی چندگی میں بیٹیا کے ہاتھ پیلے کر دیں تو سکھ شائق رہے گی ذرا۔“

اب شیکھر کی ماں نے رٹ پکڑ لی مگر شیکھر.....

پھر لاجو دیدی کے پتا جی بس یونہی اچانک بہت خاموشی سے مر گئے۔ پھر کوئی سات آٹھ ماہ بعد شیکھر کے پتا جی وہی سے آئے تو اس کی ایک نہ چلی بہت

سادگی سے بیاہ ہو گیا۔ شروع میں تو چاؤ چوچکے ہوتے ہی ہیں مگر شیکھر کی ماں نے تو حد ہی کر دی تھی لاجو کو بالکل پھللی کا چھالا بنا لیا تھا کھانا پانی تک مسہری تک پہنچا دیا جاتا تھا۔

چھٹے مہینے میں پہلی بار یہ پوچھا گیا۔ ”گود کب ہری ہو رہی ہے؟“ بے چاری کیا جواب دیتی آٹھویں مہینے میں ٹونے پٹانے شروع۔ لاجو دیدی آدھی رہ جاتیں جب سانس ہر کسی کے آگے بے اولادی کاروناروتیں مگر کبھی پلٹ کر کچھ نہ کہا بس چپ چاپ پیلیاں مانتھتی رہتیں۔

☆.....☆

شیکھر کسی پرائیویٹ فیکٹری میں صفائی کا کام کرتا تھا مگر گھر آتے ہی خود باپو بن جاتا ناہیں پیار کے لیے صوفے پر پڑ رہتا اور بیوی پر گھٹیا درجے کی فلمیں دیکھتا رہتا۔ ماں اس عرصے میں آس پاس ہی رہتی۔

”شیکھر..... کیا بات ہوئی بیٹا؟ میں حسرت ہی

